R. No. 31806?   Regd. No. 93?

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Tele. No. 29
Telegrams
"ANJUMAN"

جلد ۲۲ - شمارہ ۱۳ | ایڈیٹر - آل احمد سرور | یکم اپریل سنہ ۱۹۶۳ء

ڈاکٹر محمود الٰہی

میر کا ایک غیر مطبوعہ مرثیہ

"کلیات میر کا ایک نادر قلمی نسخہ" کے زیر عنوان میرا ایک مضمون اُردو ادب، علی گڑھ (شمارہ ۴ سنہ ۱۹۶۱ء) میں شایع ہوا تھا، جس میں میں نے کلیاتِ میر کے اس قلمی نسخے کا اجمالی تعارف کرایا تھا جو پبلک دولت لائبریری رام پور میں محفوظ ہے۔ اس نسخے میں ایک ایسا مرثیہ بھی ہے جس کے بارے میں میری یہ رائے تھی کہ یہ غیر مطبوعہ ہے لیکن اس مرثیہ کا میں نے صرف پہلا مصرع نقل کیا تھا۔ میں نے یہ بھی کہا تھا کہ ابھی اس مرثیے پر مزید تحقیق کر رہا ہوں، اگر یہ غیر مطبوعہ ثابت ہوا تو اُردو ادب کے کسی شمارے میں شایع کر دیا جائے گا۔

میں نے اب تک جو تحقیق کی ہے، اس سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ نہ تو ابھی تک اس مرثیے کا تعارف کرایا گیا ہے اور نہ میر کے کسی مطبوعہ مجموعۂ کلام میں شامل ہے۔ یہاں یہ مرثیہ اس یقین کے ساتھ نقل کیا جا رہا ہے کہ یہ کلام میر کے سلسلے میں ایک اہم اضافہ ہے:

(م ۱۰)

السلام اے کام جان مصطفیٰ
زندگانی تو نے کی ہے کیا کٹھن
السلام اے یادگارِ مرتضیٰ
آ مدینے سے ہوا غربت وطن
السلام اے مقصدِ خیر النسا
مر گئے پر پھر نہ تربت نے کفن
السلام اے پیشوائے دوسرا
السلام اے کشتۂ تیغ جفا

کیا ستم ہے خیمے دریا پر ہوئے
چارہ گر سب تیرے بے چارے گئے
اور بیچان پانی کو ہوئے
دونوں بیٹے کیا ترے پیارے گئے
لب نہ یک قطرے سے تیرے تر ہوئے
یار بھائی سب ترے مارے گئے
السلام اے تشنہ کام کربلا
السلام اے بیکس دشت وفا

گھر ترا ایک بار ویراں ہو گیا
دم نہ مارا گو کہ بے جاں ہو گیا
خاک سے مل کر تو یکساں ہو گیا
السلام اے رفتۂ راہِ رضا

تیرے سجدے میں سدا اہلِ یقیں
صبح خیزوں کی ترے در پر جبیں
وائے شامی جن کو تجھ سے بغض و کیں
السلام اے قبلۂ اہلِ صفا

ماجرا تیرا نہایت ہے شگرف
رنج میں طاقت ہوئی سب تیری صرف
خوں ہوا دل پر نہ نکلا منہ سے حرف
السلام اے غنچۂ بادِ صبا

حیف تو افسوس تو اے آہ تو
. . . . رحمت تو زہے تو واہ تو
جی سے گزرا فی سبیل اللہ تو
السلام اے عاشقِ طرزِ فنا

شان کیا کیسی امارت تیرے بعد
ہو گیا اسباب غارت تیرے بعد
پھولوں کی ہے اب حقارت تیرے بعد
السلام اے لائقِ مدح و ثنا

سانحہ تیرا ابھی یاں ہے یادگار
دل جگر لے کر گیا دونوں فگار
اِک پسر چھوڑا ہے سو بیمار و زار
السلام اے دردمندوں کی دوا

گوش زد ایسا نہیں ظلمِ عیاں
طعن کے ہمراہ پھر تیغ و سناں
غم سا تیرا غم ہو تو کریئے بیاں
السلام اے مبتلائے صد بلا

دل کو تیری آرزو ہر صبح و شام
جی کو تیری ہی تمنائے تمام
جان و دل صدقے کئے حاصل کلام
السلام اے جان و دل کے مدعا

کس جگہ آیا کہ تو حیراں ہوا
کن سیہ کاروں کا تو مہماں ہوا
کس قدر محتاجِ آب و ناں ہوا
السلام اے خلق کے حاجت روا

چشم رکھیں تجھ سے سب درویش و شاہ
کج رکھیں تیرے بھروسے پر کلاہ
آفتابِ حشر سے دے تو پناہ
السلام اے سایۂ لطفِ خدا

تجھ سے خوبیِ امامت چار چند
تیرا رایت تھا ولایت میں بلند
تیرے در کا ہر گدا اقبال مند
السلام اے شاہِ اقلیمِ ولا

تیرا داغِ ظلم کے ماروں میں ہے
یعنی تیرے تعزیت داروں میں ہے
مرحمت کر گو گنہ گاروں میں ہے
السلام اے شافعِ روزِ جزا

(اُردو ادب شمارہ ۴ ۔ ۱۹۶۹ء)

ہماری زبان

یکم اپریل ۱۹۶۳ء

اُردو میں سستی اور معیاری کتابیں

مرکزی وزارت تعلیم نے ہندی میں سستی اور معیاری کتابیں تیار کرنے کی ایک اسکیم بنائی ہے اور اس سلسلے میں کام شروع ہو گیا ہے۔ کئی ریاستوں نے اس سے پہلے ہی ایسے ادارے قایم کرتے تھے خصوصاً اُتر پردیش میں ہندی کی کتابیں بڑے پیمانے پر تیار ہوئی ہیں اور ان کتابوں میں تمام علوم کے سرمائے کو سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہندوستان کی جن قومی زبانوں کا دستور کے شیڈول میں ذکر ہے اُن میں سے بیشتر کہیں نہ کہیں علاقائی زبانیں ہیں۔ صرف سنسکرت اور اُردو رہ جاتی ہیں سنسکرت چونکہ تمام ہندستانی زبانوں کے لئے بنیاد کا کام دیتی ہے اور اس میں قدیم ہندستانی تاریخ، تہذیب اور علوم کا سارا سرمایہ ہے، اس لئے اسکی ترقی کے لئے مرکز اور ریاستیں دونوں ساعی ہیں۔ ویسے تو کشمیر میں سرکاری زبان اُردو ہے، مگر ابھی تک اُردو میں معیاری کتابیں تیار کرنے کے لئے کشمیر کی حکومت نے کوئی بڑا منصوبہ نہیں بنایا ہے۔ کئی ریاستوں میں اُردو سرکاری زبان کے بعد سب سے اہم زبان ہے اور ملک کے بیشتر حصے میں اس کے بولنے اور سمجھنے والے معقول تعداد میں ملتے ہیں، اس لئے مرکز اور ان ریاستوں میں جہاں اُردو دوسری اہم زبان ہے، اُردو میں معیاری کتابوں کے تیار کرنے کے لئے منصوبے کے تحت کام ہونا چاہئے۔ اس سلسلے میں ہم مرکزی حکومت کو توجہ دلاتے ہیں کہ وہ انجمن ترقی اُردو اور دوسرے اُردو کے اداروں کے نمایندوں اور یونیورسٹیوں کے اُردو کے شعبوں کے صدر صاحبان کا ایک نمایندہ اجتماع بلائے۔ انجمن اور دوسرے ادارے کچھ کتابوں کی تیاری اپنے ذمے لیں، کچھ کتابیں مرکز تیار کرائے، کچھ کتابیں ریاستیں تیار کرائیں۔ اس طرح یہ اہم اور ضروری کام جلد ہو سکتا ہے۔ حکومت سارا بوجھ اُٹھانے پر مشکل سے رضامند ہوگی اور اُردو کے ادارے بھی اتنا سرمایہ نہیں رکھتے کہ وہ یہ ذمے داری سنبھال سکیں، مگر دونوں مل کر یقیناً اس ضرورت کو پورا کر سکتے ہیں۔ انجمن نے مرکزی حکومت کو اس طرف توجہ دلائی ہے۔ یقین ہے کہ اُردو کے دوسرے ادارے بھی اس کام کی اہمیت کے متعلق مرکز کو لکھیں گے۔ اگر باقاعدہ کام ہو تو دس سال کے اندر ہم اُردو دنیا کی علمی ضروریات کو پورا کر سکتے ہیں۔ انجمن اس سلسلے میں ہر قسم کی کارروائی کے لئے تیار ہے۔

سیر بین

شری ہجر نویس نے جو وزارت داخلہ میں نائب وزیر ہیں اور نانگر نویس کے خاندان کے چشم و چراغ معلوم ہوتے ہیں پارلیمنٹ میں بہت قطعیت کے ساتھ کہا "یہ بالکل غلط ہے کہ ملازمتوں میں رشوت ستانی کا سلسلہ بڑھ رہا ہے۔"

ہمارا غالب پہلے ہی کہہ گیا ہے۔ ع

ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے

کلیم الدین احمد اپنی نئی کتاب عملی تنقید میں ایک جگہ لکھتے ہیں: "غزل کی خامیوں کے باوجود، وہ فنی طور پر زیادہ کامیاب ہوئے ہیں لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ اُردو کی غزل نظم نہیں بن پائی ہے۔"

غضب ہے کہ آم کی بات کرتے ہوئے کہا جائے کہ آم تو بُرا نہیں مگر وہ انناس نہیں بن پایا۔ یا نئے ہندوستان پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ فیصلہ کیا جائے کہ ہندوستان نے ترقی تو کی ہے مگر وہ انگلستان نہیں ہو سکا۔

ہندوستان انگلستان بن بھی سکتا ہے؟ آم انناس ہو بھی سکتا ہے؟ غزل نظم بن بھی سکتی ہے؟ چنبیلی کے لئے کیا ضرور ہے کہ وہ گلاب بن جائے۔ عطر حنا میں لونڈر کی بات کیوں اور کیسے آسکتی ہے۔ ہر پھول الگ حُسن رکھتا ہے۔ لیلیٰ، ہیلن نہیں ہو سکتی تھی، ہیر شیریں نہیں بن سکتی تھی۔ حُسن کو اس کی ہر آن میں، ہر ادا میں، ہر جلوے میں پہچاننا چاہئے۔

دیکھئے غالب کیا گنگنا رہا ہے۔ ؎

ہے رنگ لالہ و گل و نسریں جُدا جُدا
ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہئے

مشہور امریکی ناولسٹ جان اسٹاین بیک کو جب نوبل انعام ملا تو اُس سے ایک اخبار نویس نے پوچھا۔ "کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اب تک جن لوگوں کو یہ انعام ملا ہے اُن میں اسٹاین بیک سب سے کم اس کا مستحق ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟"

اسٹاین بیک نے نگاہیں نیچی کرلیں اور کہا "میں ان لوگوں کی رائے سے اتفاق کرتا ہوں"

اخبار نویس نے اسٹاین بیک کی طرف نگاہیں اُٹھائیں اور کہا "میں آپ سے متفق ہوں" بے چارہ صرف ہاں کہنا جانتا تھا، نہیں نہ کہہ سکتا تھا۔

غالب ہوتے تو اپنا یہ شعر پڑھتے۔ ؎

وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا تو آگ لگاتا نہ گھر کو میں

جے پور میں یوم خسرو

انجمن ترقی اُردو شاخ راجستھان کے زیر اہتمام ۶ ارمارچ ۶۳ء کی رات کو جے پور میں "یوم خسرو" منایا گیا۔ صدارت کے فرائض عزیز میاں صاحب نے انجام دئے۔ یہ تقریب جے پور کی مشہور عمارت "میرجی کا باغ" کے سرسبز و شاداب چمن کے ایک وسیع قطعہ پر مولوی سید مصباح الرحمٰن بخاری مالک عمارت مذکور کے تعاون سے منائی گئی۔

راجستھان کے وزیر تعلیم شری ہری بھاؤ اپادھیہ اجمیری نے تقریب کا افتتاح فرمایا۔

انجمن ترقی اُردو راجستھان کے جنرل سکریٹری مولوی احترام الدین احمد شاغل نے تقریب اور وزیر موصوف کا مختصر الفاظ میں تعارف کراتے ہوئے ان سے افتتاح کی درخواست کی۔

شری ہری بھاؤ نے اپنی افتتاحی تقریر میں امیر خسرو کے حالات زندگی، ان کے ظاہری و باطنی کمالات اور ان کی اتحاد کوشی پر نہایت شستہ الفاظ میں تقریر فرمائی اور اہل ملک کو ان کے کردار و حالات سے سبق حاصل کرنے اور اس پر عمل پیرا ہونے پر توجہ دلائی۔

اس کے بعد مقالات کا آغاز ہوا۔ خان خداداد خاں مونس نے ایک معلوماتی اور ٹھوس مقالہ حضرت امیر کی تصانیف پر پیش کیا اور متعدد مادہ ہائے تاریخی نظم و نثر میں سنائے۔ مقالات ہی کے دور میں حضرت بہزاد نے اپنے وجد آفریں اشعار و لحن سے تلاطم بپا کر دیا اور پھر خود شاغل صاحب نے اپنا مقالہ پیش کیا۔ پھر شیخ مشکور علی برقی جے پوری نے اپنا مفصل و مدلل مقالہ پڑھا۔ بعد ازاں باقاعدہ مشاعرہ شروع ہوا۔ (نامہ نگار)

پنجاب میں اُردو اہلِ قلم کی حوصلہ افزائی

چنڈی گڑھ۔ پنجاب کے محکمۂ السنہ نے سال گزشتہ کی طرح اس سال بھی جن ادیبوں، شاعروں اور فن کاروں کو مالی امداد، انعامات اور اعزازات دینے کا فیصلہ کیا ہے اُن میں اُردو کے اہل قلم بھی شامل ہیں۔

جن اصحاب کو سال رواں کے لئے چھ چھ سو روپے کی امداد دئے جانے کا فیصلہ کیا گیا ہے ان میں اُردو کے کہنہ مشق شعرا جناب امرچند قیس جالندھری، جناب پورن سنگھ ہنر امرت سری مشہور رباعی گو، جناب اختر رضوانی اور نوجوان ادیب و شاعر جناب سورج تنویر بھی شامل ہیں۔

علاوہ ازیں اُردو کے بلند پایہ صحافی سردار دیوان سنگھ مفتون، ایڈیٹر ہفتہ وار ریاست (مرحوم) کو گیارہ سو روپے اور اعزاز دینے کا فیصلہ ہوا ہے۔

انجمن ترقی اُردو شکر نگر کا تعزیتی جلسہ

انجمن ترقی اُردو شاخ شکر نگر کے زیر اہتمام ۱۶ رمارچ ۱۹۶۳ء کو ایک تعزیتی جلسہ سید عبدالرشید صاحب رنگین کی صدارت میں بسلسلہ انتقال محبوب علی خاں صاحب چیف میکانیکل انجینیر نظام شوگر فیکٹری و رکن انجمن ہذا منعقد ہوا۔ جس میں مولوی حافظ رفیق احمد صاحب منصف اور غلام محمد مصطفےٰ ساغر معتمد انجمن نے ان کی ادبی دلچسپیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے خراج عقیدت پیش کیا اور حاضرین جلسہ نے حسب ذیل قرار داد تعزیت منظور کی۔

مولوی محبوب علی خاں صاحب چیف میکانیکل انجینیر نظام شوگر فیکٹری و رکن انجمن ہذا کے بے وقت اور اچانک سانحۂ ارتحال پر اراکین انجمن گہرے رنج و غم کا اظہار کرتے ہیں اور مرحوم کے پسماندگان کے غم میں برابر کے شریک ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ پروردگار عالم مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (ساغر حیدرآبادی)

انجمن ترقی اُردو ٹکاری کا تعزیتی جلسہ

۲۲ رمارچ کو انجمن ترقی اُردو ٹکاری کے اراکین کا ایک تعزیتی جلسہ صدر انجمن حضرت ثمر ٹکاری کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں بلبل بہار حضرت علامہ بسمل کابری ٹکاروی کی وفات حسرت آیات کو اُردو زبان کے لئے سانحۂ عظیم قرار دیتے ہوئے ان کے پسماندگان سے اظہار ہمدردی کیا گیا۔ جناب ثر ٹکاروی اور سحر ٹکاروی نے قطعات تاریخ سنائے۔ حضرت ثمر مدظلہ نے بھی ایک قطعہ تاریخ پیش کیا۔

(محمد محمود عالم سحر ٹکاروی)

انجمن معین الادب سہسرام

انجمن معین الادب کا سالانہ جلسہ ۱۷ رمارچ ۱۹۶۳ء کو زیر صدارت حشر سیمابی سہسرامی منعقد ہوا۔ جس میں اراکین انجمن نے متفقہ طور پر حسب ذیل تجاویز منظور فرمائیں۔

عا۔ یہ جلسہ مسلم گرلز مڈل اسکول میں ایسی استانیوں کے تقرر پر جو اُردو قطعی نہیں جانتیں، اظہار تشویش کرتا ہے کیونکہ وہ طالبات کو ان کی مادری زبان میں تعلیم نہیں دے سکتی ہیں اس لئے یہ جلسہ پُرزور الفاظ میں مطالبہ کرتا ہے کہ تقرر کے وقت اُردو کی واقفیت لازمی قرار دی جائے۔

عا۔ یہ جلسہ اس بات پر اظہار تشویش کرتا ہے کہ بار بار مطالبہ کرنے کے باوجود مدرسہ کی پرانی مجلس عاملہ میں ہنوز کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ مجلس عاملہ کے اکثر ارکان کو اسکول کی فلاح و بہبود سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور ان کا نام صرف زینت قرطاس ہے اس لئے پر زور مطالبہ کرتا ہے کہ گورننگ بوڈی میں دو ارکان کا اضافہ مقامی انجمن ترقی اردو اور انجمن معین الادب کے مشورے سے کیا جائے۔ (تمنا سہسرامی)

سیدہ حرمت الاکرام

یہ روشنی

روشنی ایک مرکز پہ ٹھہری نہیں
اور آگے بڑھو اور آگے چلو
رہروو! شمع کی طرح خود بھی جلو
اس بیاباں کی پہنائیوں میں نظر
گردِ غم کے سوا اور کیا پائے گی؟
جھلملاتے سرابوں کی آغوش میں
زندگی آرزوؤں کو بھٹکائے گی

اور آگے بڑھو ورنہ یہ روشنی
حلقۂ دسترس سے نکل جائے گی
رات کے جام تیرہ میں ڈھل جائے گی
تم کو ہے روشنی کی تمھیں جستجو
تم کو ہے روشنی کی تمھیں آرزو
اس مچلتی کرن کو بھٹکنے نہ دو
اس مچلتی کرن کے جلو میں چلو
تم رکو گے تو یہ برق پا روشنی
حلقۂ دسترس سے نکل جائے گی
پھر یہ دھندلی کرن بھی نہ ہوگی کہیں
روشنی ایک مرکز پہ ٹھہری نہیں

زیدی جعفر رضا۔ ایم اے۔

میں اپنے وطن کا شاعر ہوں

ہر بات یہاں کی سندر ہے ہر بات یہاں کی پیاری ہے
ہر دن خوشیوں تیوہاروں کا ہر رات یہاں کی پیاری ہے
ہر دھرم یہاں کا البیلا ہر ذات یہاں کی پیاری ہے
یہ گنگ و جمن کی دھرتی ہے میں گنگ و جمن کا شاعر ہوں
یہ میرا وطن ہے میرا وطن میں اپنے وطن کا شاعر ہوں
اونچی پربت مالاؤں میں اونچے اونچے کہساروں میں
چھم چھم چھم کرنے والے مندر مسجد گرودواروں میں
نیلے امبر کے آنچل میں چمکیلے چاند ستاروں میں
اک جیون پایا جاتا ہے میں اس جیون کا شاعر ہوں
یہ میرا وطن ہے میرا وطن میں اپنے وطن کا شاعر ہوں
چنگیز و بلا کو آئے یہاں کیسے کیسے ارمان لئے
ہر ایک کا خنجر ٹوٹ گیا جب ہم نے سینے تان لئے
ہر دور میں ہم بل جائیں گے ہاتھوں پر اپنی جان لئے
یہ دیش ہے ویروں کا مسکن میں اس مسکن کا شاعر ہوں
یہ میرا وطن ہے میرا وطن میں اپنے وطن کا شاعر ہوں

عادل منصوری

نیند کی کالی دیوار پر...

نیند کی کالی دیوار پر...
خواب کی ادھ کھلی کھڑکیوں میں
لرزتے ہوئے
گہرے گہرے سے
پردوں کے پیچھے سے پھر
مجھ کو گھائل ستاروں نے آواز دی
میں بڑھا کھڑکیوں کی طرف
دفعتاً
درد کے چاند نے
نیند کی کالی دیوار کو ڈھا دیا
صبح دم...
کچی اینٹوں کے ملبے کے پیچھے سے پھر
یاس کے پیلے سورج نے آواز دی
کس کو آواز دی؟
کس کو آواز دی؟

غزلیں

ظہیر غازی پوری

خامشی کے ساتھ رازِ دل عیاں ہونے تو دو
داستانِ غم اشاروں میں بیاں ہونے تو دو
کتنے پیکر میرے ہاتھوں سے بنیں گے شاہکار
میرے فن کو رشکِ صد شیشہ گراں ہونے تو دو
چارہ سازو پھر مرا جوشِ جنوں بڑھ جائے گا
پھر مری جانب نگاہِ گل رخاں ہونے تو دو
تنکا تنکا پوچھے گا برقِ سوزاں کا مزاج
اک ذرا تعمیر میرا آشیاں ہونے تو دو
پھر صبا ان کا پیام لطف لائے گی ظہیر
موسمِ گل کو نگہبانِ خزاں ہونے تو دو

آفتاب شمسی

کس طرف سے آئی تھی برق یہ نہیں معلوم
اتنا یاد ہے اب تک آشیاں بنایا تھا
ساری زندگی ہم نے انتظار میں کاٹی!
پھر بھی ایسا لگتا ہے جیسے کوئی آیا تھا
دورِ جام و مینا بھی کتنا پرمسرت تھا
انکھڑیوں کی صہبا تھی گیسوؤں کا سایا تھا
آج اس فسانے پر اک ہنسی سی آتی ہے
مجھ کو جس فسانے نے مدتوں رلایا تھا

محمود رضوی، ایم اے (علیگ)

شاد عارفی — فن اور شخصیت

ادب اور ادیب کے بارے میں کوئی بھی سادہ سا مسئلہ جو بالکل سہل اور سامنے کی بات معلوم ہوتا ہے ناقدین اور مبصرین کے لئے بہترین اور دلچسپ موضوع بحث بن جاتا ہے۔ ایک تنقید نگار کسی کے کلام میں دن کی روشنی ثابت کرتا ہے تو دوسرا بلاخوف تردید کہہ دیتا ہے کہ ان کے یہاں تو رات سے بھی زیادہ تاریکی ملتی ہے۔ اس سلسلے میں مولانا حالی کی مثال پیش کرنا لطف سے خالی نہ ہوگا۔ ناقدین میں سے کچھ کا کہنا ہے کہ حالی صرف مسدس کے شاعر تھے، نظم گوئی کے مرد میدان تھے۔ تغزل سے ان کو فطری مناسبت نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ فرسودہ روش اور پٹی ہوئی لکیر کو چھوڑ کر رسمی اور تقلیدی شاعری سے کنارہ کش ہوگئے۔ اور سرسید کی صحبت کا فیضان تھا جو انھیں بیکڑ سے قومی پلیٹ فارم پر کھینچ لایا۔ مگر مولانا حالی کے بارے میں کچھ نقادوں کی حتمی اور اذعانی رائے ہے کہ حالی کو قدرت نے صرف غزل گوئی کے لئے پیدا کیا تھا۔ ان کو سرسید کی صحبت راس نہ آئی۔ سرسید کا حلقۂ کار حقیقت پسندی اور عمل پیہم کا میدان تھا اور حالی کی رگ رگ پے میں بادۂ تغزل کا سرور رچا ہوا تھا۔ وہ فطری شاعر تھے اس لئے سرسید کی رفاقت حالی کی شاعری کے حق میں غیر مفید ثابت ہوئی۔

مختصر یہ کہ مولانا حالی کے بارے میں خیال ایسا ہی ہے کہ وہ غزل گوئی سے زیادہ مناسبت رکھتے تھے۔ پند و نصائح کے خشک مضامین کو بھی انھوں نے تخیل اور تغزل کی مہارت و ممارست کی وجہ سے دلچسپ اور پُر اثر بنا دیا۔ مگر جو تیکھاپن اور رچا ہوا مذاق حالی کی غزلیات میں ہے ان کی منظومات میں نظر نہیں آتا۔ حالی کو مسدس کا شاعر مانا جاتا ہے اور یہی ان کا سب سے بڑا کارنامہ ہے لیکن حالی کی نشتریت، اشاریت، رمزیت اور حسن بیان، وسعت تخیل غرض جملہ خصوصیات شاعری کے اعلیٰ نمونے ان کے دیوان غزلیات ہی میں ملتے ہیں۔ مسدس لکھ کر مولانا حالی نے سرسید کے لئے زادِ آخرت ضرور مہیا کر دیا۔ لیکن یہی حالی اگر میدان غزل میں اپنا ترکتاز جاری رکھتے اور ساری فطری صلاحیتیں اسی جانب لگا دیتے تو غالباً ادب العالیہ کے کچھ نادرہ کار اور بیش قرار نمونے اُردو تغزل کی زیبائی کا سامان ہوتے۔ اور ممکن ہے کہ بعض صلاحیتوں اور خصوصیات کے باعث وہ اپنے استاد مرزا غالب کی ہمسری بلکہ پیش روی کے حقائق بھی بے نقاب کرتے۔

شاد صاحب کے بارے میں بھی مبصرین اور ناقدین ایسی ہی مختلف رائیں رکھتے ہیں۔ کوئی انھیں نظم کا مرد میدان بتاتا ہے تو کوئی غزل گوئی کا بادشاہ ظاہر کرتا ہے۔ شاد صاحب غزلیں بھی کہتے ہیں اور بلند پایہ نظمیں بھی۔ اور کہتے یوں ہیں کہ وہ ایک مکمل شاعر ہیں۔ ہمارے سامنے ایسی اور مثالیں موجود ہیں مثلاً یہ امر ثابت شدہ ہے کہ ذوق کا میدان شاعری قصیدہ خوانی ہے۔ غزل گوئی نہیں۔ لیکن استاد ذوق نے شاعرانہ صلاحیتوں اور ذہن رسا کے بل بوتے پر کامیاب غزلیں کہیں۔

غزل مسلسل نہیں ہوتی۔ موضوع کے لحاظ سے غزل کا ہر شعر منفرد ہوتا ہے۔ ایک غزل مختلف اور متنوع مضامین کا مجموعہ ہوتی ہے اور رنگا رنگ پھولوں کا گلدستہ۔ نہ کہ ایک ہی رنگ اور ایک ہی قسم کے پھولوں کا انبار۔ مولانا حالی کی طرح بظاہر حضرت شاد بھی ایک وقت میں یہ کہہ دیتے ہیں: ؎

دس پانچ برس حضرت حالی کی طرح شاد
مجھ کو بھی جنونِ لب و رخسار رہا ہے
اس وقت کہ ماحول بھی للکار رہا ہے
کیا موقعۂ رنگینیِ اشعار رہا ہے

لیکن آگے چل کر خود ہی اپنی تازہ روش کے بارے میں یہ فیصلہ فرماتے ہیں: ؎

تائید غزل کے بارے میں دو چار اشارے کیا کم ہیں
نو لمبی لمبی نظموں سے نو شعر ہمارے کیا کم ہیں

یہ صرف شاعرانہ اور سخن گسترانہ بات نہیں بلکہ بیان واقعہ اور اظہار حقیقت بھی ہے۔ حضرت شاد نے "فسانۂ ستم" کو "بڑے ہنر" اور "چناں چنیں" اور "اگر مگر" کے ساتھ کہنے کے لئے نظموں کی بجائے "تنگ دامانیِ غزل" کے باوجود غزل ہی کو پسند کیا ہے ؎

فسانۂ ستم بڑے ہنر سے کہہ رہا ہوں میں
چناں چنیں کے ساتھ اگر مگر سے کہہ رہا ہوں میں

مولانا حالی کی مثال دے کر میں اپنا نظریہ واضح کر چکا ہوں کہ مولانا حالی کو ان کے دیوان غزلیات ہی نے باکمال شاعر بنایا ہے۔ آخر عمر میں کمال فن حاصل ہونے کے باوجود حالی صرف ناصح مشفق بن کر رہ گئے تھے۔ اور اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ "دل زندہ" نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ لیکن میری رائے میں شاد صاحب زندہ دل ہیں، جوان ہمت ہیں، اور آخر عمر تک زندہ دلی اور اولوالعزمی ان کی فطرت مضطرب سے الگ نہ ہو سکے گی۔ اس لئے وہ اپنے دل کی "رام کہانی" کہنے سے کسی طرح باز نہیں رہ سکتے۔

ان کی ہر غزل میں جہاں ہمیں ماحول پر پھبتیاں، اجتماعی سیاست پر نشتر زنی ملتی ہے وہاں ایک آدھ شعر ایسا ضرور نظر آجاتا ہے جس میں حقیقی تغزل کی روح کارفرما ہوتی ہے۔ حالانکہ انھوں نے خود غزل کی شاعری کو اپنے ایک شعر میں ریشمیں شاعری کہا ہے: ؎

مجھے بھی شاد ریشمیں شاعری کا شوق تھا
مگر وہ عمر خوشی کی تھی یہ آگہی کی ہے

اگر "بزم حق و باطل" میں "فولاد" بن کر ضرب کاری کو اپنا فرض عین تصور کرتے ہوئے بھی ان کی سنگین غزل میں جا بجا ابریشم کی یہ نرمی "حلقۂ یاراں" میں ایک خاص لطف دے جاتی ہے۔ ان کے اس رنگ کے اشعار خالص غزل کے اشعار ہوتے ہیں۔ سیدھے سادے الفاظ میں محاکات کا عالم پیدا ہو جاتا ہے جو صرف ان کے قلم سے ہی ممکن ہے۔ ورنہ "ولی سے داغ تک بکھرے ہوئے یکساں افسانوں" میں کوئی متنوع رنگ نکھارنا خاصا دشوار کام ہے۔ اس موقع پر ان کا ایک شعر پیش کرنا کافی ہوگا: ؎

وہ دیکھتا رہا کہ میں اسی کو دیکھتا رہا
جبھی تو کہہ رہا ہوں کامیاب مدعا رہا

اس شعر کو پڑھ کر ذہن فوراً شاد صاحب کے اسی قبیل کے ایک دوسرے شعر کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ ؎

جذبۂ محبت کو تیر بے خطا پایا — میں نے جب اسے دیکھا دیکھتا ہوا پایا

غالب کی زمین میں غالب کے بعد خاص تغزل کا بھرپور شعر۔ دونوں شعروں کو شاد صاحب ہی کے قول کی روشنی میں پرکھنا چاہیے۔ "لطافت بیان واقعۂ غزل کی جان ہے" یہی نہیں، جہاں بھی طنز کی لے دھیمی ہے وہاں بھی ایک مخصوص نرم لہجے سے "چیزے دگر" پیدا ہو جاتی ہے۔ ؎

کم سے کم یہ تو قیامت نہیں پہچانوں میں
آپ ہندو تو نہیں، آپ مسلماں تو نہیں

گو مضمون پرانا ہے مگر کہنے کا انداز خاص شاد صاحب ہی کا حصہ ہے۔ دوسرا مصرع ان کے مخصوص مکالماتی رنگ کا حامل ہے۔ اسی غزل کا مقطع بھی کیا خوب ہے۔ ؎

شاد صاحب جو ہنسے پڑتے ہیں ہر بات پہ آپ
آج وہ ہوش رُبا آپ کا مہماں تو نہیں

پہلے مصرع میں "ہنسے پڑتے ہیں" ان کے رنگ کی گہری چھاپ لئے ہوئے ہے۔

شاد صاحب کے یہاں ندرت ادا کے ساتھ ساتھ جدت تخیل کی بھی کوئی کمی نہیں۔ وہ لطافت بیان کو جتنا اہم خیال کرتے ہیں اتنا ہی ضروری مضمون کی تازگی کو بھی۔ ہمارے شعرا نے شراب و ساقی پر مختلف انداز سے طبع آزمائی کی ہے۔ بادۂ عرفاں ہو یا شراب انگور یا چشم ساقی کے لطیف اشارے، اپنی تمام نشہ خیزیوں کے ساتھ اردو غزل کی سرمستی میں اضافہ کرتے رہے ہیں، اور پھر بھی شاعر کو شکایت رہی کہ ؎

نہ بندھے تشنگی ذوق کے مضموں غالب
گرچہ دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا

اس سلسلے میں شاد صاحب کا ایک شعر پیش کرنا بے جا نہ ہوگا جس میں انھوں نے "بادۂ دیرینہ" کو چھوڑ کر ایک بالکل نئی شراب پیش کی ہے۔ ؎

ایسی شراب جس کی زمانے کو بو نہ آئے
میری نظر کسی کے تبسم کو چھو نہ آئے

"آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں" اس کے سوا اور کچھ کہنا بات کو طول دینا ہے۔

تغزل کو چھوڑ کر اب ہم شاد صاحب کے خاص کارنامے یعنی طنز پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ انھوں نے عوامی نظموں سے لے کر پوری پوری طنزیہ غزلیں لکھی ہیں، اور سماج کے رستے ہوئے ناسوروں پر نمک چھڑکا ہے۔ سماج یا فرد، دوست یا دشمن جہاں بھی انھوں نے کچھ نقص دیکھا، اس کی شان میں قصیدہ کہہ دیا۔ 'مہترانی'، 'گنگا اشنان' وغیرہ وغیرہ اسی قسم کی نظمیں ہیں۔

حضرت شاد کا طنز دو قسم کا ہے۔ چٹکی لینے والا اور قطعی جس کو انگریزی میں (To hit the nail on the head) کہا جا سکتا ہے۔ گو اول الذکر بہت کمی کے ساتھ ہے اور اس کی بہترین مثال ذیل کا شعر ہے ؎

جاپ جپ کر جو ہنسا دی بھی اٹھا لا ساقی — شیخ صاحب ہیں یہیں کہتا تھا مسلماں کوئی
یا
جناب شیخ ہی اب رہ گئے ہیں لے دے کر — وہ دن گئے کہ کسی برہمن پہ چوٹ کروں

دوسری قسم کا طنز جو ان کا خاص انداز ہے ان کے پورے کلام کو اپنی آغوش میں سمیٹے ہوئے ہے۔ اور جس کی تعریف انھوں نے اپنے اس شعر میں کی ہے۔ ؎

سننے کو ان کی محفل میں سب گونگے بہرے بن بیٹھے
ماتھوں پہ شکنیں پڑتی ہیں جب سچی سچی کہتا ہوں

اس طرح کے طنز میں صداقت کی تلخیاں اپنے عروج پر پہنچی ہوتی ہیں۔ دو، تین مثالیں کافی ہوں گی۔ ؎

ہے تو احمق چونکہ عالیشان کاشانے میں ہے — اس لئے جھک مارنا بھی اس کا فرمانے میں ہے

شاد صاحب نے غالباً کسی فرد واحد کے لئے ہی کہا ہوگا مگر نہ معلوم ہمارے سماج میں کتنے ہی افراد پر صادق آتا ہے۔ زیادہ وضاحت کرنے سے فائدہ بھی کیا؟

ان کے مداح اس زمانے میں — جیسے کُتّے قصائی خانے میں

اور

سیاہ کاروں کی رستیوں سے خدا کا طرزِ عمل نہ کہیے
نمک حراماں قوم جس سے گھٹیں وہ ضرب المثل نہ کہیے

حضرت شاد نے ہمارے سماج کی دُکھتی رگوں پر انگلیاں رکھی ہیں، اور نمک حراماں ملک و قوم کو اپنی نئی نئی ضرب الامثال سے گھٹنے پر مجبور کرتے رہے ہیں۔ لیکن یہ حالات کی ستم ظریفی نہیں تو اور کیا ہے کہ خود ان کی زندگی ایک درد بن کر رہ گئی۔ دماغ کی گھٹن تو اشعار کا جامہ پہن کر باہر آجاتی ہے لیکن دل کی گھٹن، خدا کی پناہ!! ایک طویل عرصے سے زندگی انھیں بسر کر رہی ہے۔ ایک شعر میں انھوں نے کہا ہے۔ ؎

مجھ سے اچھے ہیں مرے اشعار شاد — باڑھ کاٹے نام ہو تلوار کا

یقیناً وہ دست قدرت میں ایک چلتی ہوئی تلوار ہیں جس کی باڑھ ان کی شاعری ہے۔ پھر ان کی پریشانیوں کو مد نظر رکھتے ہوئے ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ تلوار ایک پھٹے پرانے نیام میں (جسے نیام کہنا ہی مناسب ہوگا) اپنی آب و تاب چھپائے ہوئے ہے۔ اس موقع پر ایک قدیم کشمیری نژاد شاعر کا فارسی شعر برمحل یاد آرہا ہے جو شاد صاحب جیسے جوہر افغان کے بالکل حسب حال ہے۔ ؎

باچشم کم مبیں تن ظاہر ذلیل را — بحث از علاف کہنہ چہ تیغ اصیل را

بہر حال وہ زہر آلود زندگی کے تلخ گھونٹ بغیر منہ بگاڑے سسکتے ہوئے پئے جا رہے ہیں۔ ہاں قدرت سے صرف اتنی شکایت ضرور ہے۔ ؎

زرد چہروں نے تبسم کو کیا ہے رسوا — ورنہ ظاہر بھی نہ ہوتا کہ پریشان کوئی

اب وہ اس منزل سے گزر رہے ہیں جہاں "مشکلیں پڑیں کہ آسان ہو جاتی ہیں"۔ ان کی صحت برائے نام باقی ہے ورنہ غالب نے غالباً ان کے لئے ہی کہا تھا ؎

در کشاکش ضعفم نگسلد روان از تن
اینکہ من ہمی میرم ہم ز ناتوانیہاست

مشق سخن فرماتے ہوئے ان کو ۳۰، ۴۰ سال گزر گئے ہیں مگر معلوم ہوتا ہے آج کل شاید شاد صاحب کی دلی آرزو اس شعر پر عمل پیرا ہونے کی ہے۔ ع: "ہے مشق سخن جاری، چکی کی مشقت بھی"۔ اور وہ ؎

چمن کو آگ لگانے کی بات کرتا ہوں — مجھے سلو تو سلگانے کی بات کرتا ہوں

جیسے مطلعے کہہ کر اس خواب زنداں کو حقیقت میں مبدل دیکھنا چاہتے ہیں۔ ویسے ان کا Plea یہ ہے کہ گھر پر چٹنی سے ملتی ہے اور جیل خانے میں دال سے ملے گی۔ کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عروس دہر اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ ان پر مائل جور و ستم رہی ہے اور ہر لحظہ طربناک حسن گریزاں کی مانند ان سے کترا کر نکلتا رہا اور ان کی پوری زندگی فانی کے اس شعر کی تفسیر ہو گئی ؎

نہیں ضرور کہ مر جائیں جاں نثار ترے — یہی ہے موت کہ جینا حرام ہو جائے

میخانۂ کائنات میں ان کا پیمانۂ حیات بادۂ عیش و نشاط کے بجائے صرف خون دل و جگر ہی سے لبریز رہا۔ لیکن پھر بھی وہ تمام عمر "لطف محرومی" اور "کیف شکست دل" کو "انعام دوست" ہی سمجھتے رہے۔ غموں نے ان کا سینہ چھلنی کر دیا ہے مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کچھ ٹکڑے ابھی اور باقی ہیں اور اس عمر میں قید و بند کی سختیاں سہہ کر مصائب کی معراج پر پہنچنا چاہتے ہیں۔ تاکہ ؎

اس نے جب سو تیر لگائے — میں نے ایک غزل چپکا دی

کہنے کے بجائے حجرۂ زنداں میں اسی "حقیقت منتظر" کو جس کے "لباس مجاز" میں آنے کے لئے اقبال بیتاب رہے تھے مخاطب کر کے رومی کا یہ لافانی شعر پڑھ رہے ہوں ؎

سینہ خواہم شرحہ شرحہ از فراق — تا بگویم شرح درد اشتیاق

ایلیٹ کی مشہور امپرسنل (Impersonal element) کی تھیوری ہے کہ شاعر بحیثیت انسان ایک علیحدہ شخصیت رکھتا ہے اور بحیثیت شاعر وہ دوسری شخصیت کا مالک ہوتا ہے۔ اور ان دونوں حیثیتوں میں کوئی خاص ربط نہیں ہوتا۔ لیکن حضرت شاد کے معاملے میں مجھے یہ نظریہ کچھ زیادہ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ شاد صاحب اول بھی شاعر، آخر بھی شاعر، ظاہر میں بھی شاعر اور باطن میں بھی شاعر۔ وہ سر تا سر شاعر ہی شاعر ہیں۔ صرف شاعری ہی ان کا سرمایۂ حیات ہے۔ اور افسوس صد افسوس کہ اس زمانے میں صرف شاعری ہی ان کا ذریعۂ معاش ہے۔ جیسا کہ انھوں نے خود ظاہر فرمایا ہے کہ "آج میری حالت یہ ہے کہ کچھ شاگردوں اور کچھ نظموں کے معاوضے سے چائے پانی میسر آجاتا ہے۔"

کتنی افسوسناک حقیقت ہے اور شرمناک بات! جو ہستی ان حالات میں گرفتار ہو اس سے تلخ نوائی کے سوا اور کیا امید کی جاسکتی ہے ؎

وہ رنگیں نوائی، یہ شعلہ بیانی — کسی موڑ آئے مری شاعری میں

لیکن یہ انھیں کی ہمت اور دل گردہ ہے کہ ایسے نامساعد حالات میں رندانہ مزاجی اور قلندرانہ سرشت کو تھوڑی سی دیر کے لئے بھی فراموش کرنے پر آمادہ نہیں کئے جاسکتے۔ کسی کی بخیلی سے مرعوب یا سرد مہری سے مایوس ہو کر وہ "سبک سر" بن کر باعث "سرگرانی" معلوم نہیں کرتے۔ وہ اپنی "وضع نہیں بدل سکتے"۔ آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے وہ ان کے لب تک آجاتا ہے ؎

وہیں سے شعر میں برجستگی نہیں رہتی — جہاں سے حال چھپانے کی بات کرتا ہوں

تصنع سے انھیں بیر ہے۔ "وظیفہ خوار" ہو جائیں تب بھی "شاہ کو دعا" نہیں دیں گے۔ ظاہر ہے کہ ایسے بلند نظر "سدرہ نشین شاہبازوں کا نشیمن" "یہ کنج محنت آباد" نہیں ہو سکتا۔ وہ تو "کنگرۂ عرش" کی "صفیر" کے منتظر ہیں کہ اس "دام گاہ" سے گلو خلاصی کی صورت ممکن ہو سکے۔ خدا انھیں عمر خضر عطا کرے لیکن حضرت شاد ہی کے الفاظ ہیں "میری خواہش ہے کہ میں بھارت میں مروں۔ بھارت میں بھی اس طرح کہ جیل میں موت آئے تاکہ میری شاعری پر "تلخی کی مہر لگ جائے"۔" آپ نے سن لی۔ یہ ہے "شکست شیشۂ دل کی صدا"! اور پھر اس حالت میں اگر "ذوق نغمہ کی کم یابی" ہو تو شاعر اپنی "نوا" کو "تلخ تر" کر دینے کا عادی کیسے نہ ہو جائے۔ اور پھر ایسا شاعر جو اپنے درد کو "منت کش دوا" کرنا پسند نہیں کرتا ہو اور اپنے "اچھا نہ ہونے" کو برا نہ سمجھتا ہو۔ جیسا کہ انھوں نے کہا ہے ؎

ہر تغیر پہ مسکرانا بہتر — زندگانی سے ہاتھ اٹھانا بہتر
جس کنارے میں جذب ہو کھوئی — اس کنارے سے ڈوب جانا بہتر

شاد صاحب اصاحب طرز شاعر ہیں۔ ان کا ایک مخصوص زاویۂ فکر ہے۔ جو طنز و سیاست کے امتزاج سے پیدا ہوتا ہے۔ ندرت ادا ان کے کلام کی جان ہے۔ وہ کامیاب طنز نگار ہیں اور تغزل میں طرز جدید کے موجد۔ انھوں نے اردو ادب کو کچھ جدید اقدار اور مختلف پیرایہ ہائے بیان عطا کئے ہیں اور اس رنگا رنگی کے باوجود ان کا ایک خاص اسلوب ہے۔ ایسا اچھوتا اسلوب کہ خواجہ حسن نظامی کی نثر اور غالب کے خطوط کی طرح کوئی دوسرا کامیابی کے ساتھ ان کی روش نہیں اپنا سکتا۔ وہ خود ہی اپنے طرز کے موجد ہیں اور غالباً خود ہی خاتم رہیں گے۔

[illegible]

اُردو سماج جمشید پور

۲۳ مارچ کو جمشید پور اُردو سماج کے زیر اہتمام آل انڈیا اُردو سمپوزیم اور مشاعرہ کی سہ روزہ تقریب کا ڈپٹی کمشنر سنگھ بھوم مسٹر جے۔ پی سریواستوا نے افتتاح کیا۔ مسٹر سریواستوا نے اس غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کی جو بعض حلقوں میں پھیلی ہوئی ہے کہ ہمارے ہاں قومی یک جہتی قائم کرنے میں علاقائی حد بندی کی جا رہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس وقت قومی یک جہتی کی اشد ضرورت ہے اور یہ صرف زبان کی مشترکہ گاڑی ہی کے ذریعہ ممکن ہے۔ صرف ہندی کے ذریعہ لازمی نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ قومی یک جہتی کے لئے تمام زبانوں کو غیر مشروط طور پر تسلیم کرنے کی ضرورت ہے۔ اس سے خیالات کے اتحاد میں بڑی مدد ملے گی۔

اس سے پہلے جمشید پور اُردو سماج کے صدر مسٹر ایس۔ ایم۔ شفیق نے یوم بھگت سنگھ کے سلسلے میں بھگت سنگھ کی تصویر کی نقاب کشائی کی۔ سامعین کی کثرت تھی۔ نقاب کشائی کے وقت تمام سامعین شہید بھگت سنگھ کی تعظیم میں خاموش کھڑے رہے۔

بزم شعر و ادب ناگ پور

۱۶ مارچ ۱۹۶۳ء کو زیر صدارت طرفہ قریشی صاحب "بزم شعر و ادب" کے زیر اہتمام ایک تعزیتی نشست بیادگار حضرت مولانا شفیق جون پوری مرحوم مومن پورہ ناگپور میں منعقد کی گئی۔ طرفہ قریشی صاحب نے شفیق کی ابتدائی زندگی پر روشنی ڈالی اور ان کے متفرق اشعار سنائے۔ نشست کا آغاز حضرت شفیق کی نعت سے ہوا جس کو جناب خلیل الرحمٰن صاحب نے پیش کیا۔ (سید شوکت علی)

مدراس کے ایک اُردو صحافی کا انتقال

ہم نہایت رنج و افسوس کے ساتھ یہ خبر درج اخبار کرتے ہیں کہ جناب محمد ابراہیم کمال پریمی ہفتہ وار اخبار "انصاف" مدراس کے مالک مدیر و ناشر ۱۶ مارچ کو اچانک حرکت قلب بند ہونے کی وجہ سے انتقال کر گئے۔ (مسلمان۔ مدراس)

ایک سائنس داں کو موت کے منہ سے بچا لیا گیا

مشہور روسی سائنس داں پروفیسر لینڈاؤ جنھیں طبیعیات کے شعبے میں نوبل انعام مل چکا ہے، موٹر کے حادثے کی وجہ سے جان کا خطرہ لاحق تھا۔ اب وہ تندرست ہو گئے ہیں کہ وہ اپنے مضمون پر دلچسپی کے ساتھ گفتگو کرتے ہیں۔ تین دفعہ ان پر وہ کیفیت طاری ہوئی جسے "کلینیکل موت" کہتے ہیں۔ وہ دو مہینے تک بیہوش رہے۔ انھیں مصنوعی طور پر غذا دی گئی اور لوہے کے پھیپھڑے نے ان کی سانس جاری رکھی۔ سو سے زیادہ ڈاکٹروں نے ان کے علاج معالجے میں حصہ لیا۔ دوسرے ملکوں کے ممتاز سائنس دانوں نے اپنے مشورے سے مدد دی۔ اس حیرت انگیز علاج معالجے پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک ڈاکٹر نے لکھا ہے کہ اسے درحقیقت طب کا ایک معجزہ کہہ سکتے ہیں۔

دلّی رائٹرس ایسوسی ایشن

۲۶ مارچ ۱۹۶۳ء کو دلّی رائٹرس ایسوسی ایشن (نئی دلّی) کا ایک خصوصی اجلاس زیر صدارت جناب رائے بہادر ماتھو رام اگروال منعقد ہوا۔ شرکاء جلسہ میں رفعت سروش، راج نرائن راز، کمار پاشی، محسن زیدی، صغیر احمد صوفی، بلراج حیرت، جمیل عالی، کرشن موہن، کیلاش ماہر کے نام خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں۔

خصوصی مہمان شاعر جناب کرشن موہن نے اپنی شعری تصانیف "شبنم شبنم، دل ناداں" اور "تماشائی" سے پسندیدہ نظمیں اور غزلیں سنائیں۔ دیگر شعراء نے بھی سامعین کو اپنے کلام سے محظوظ فرمایا۔ (کیلاش ماہر۔ سکریٹری)

وزیر اعظم نہرو سے سوویت عالموں کی ملاقات

۲۳ مارچ کو سوویت یونین کے دو ماہرین علم الہند لیوکوفسکی اور چیچروف نے نئی دلی میں، وزیر اعظم جواہر لال نہرو سے ان کے دفتر میں ملاقات کی، اور سوویت اکاڈمی کے اقوام ایشیا کے انسٹی ٹیوٹ کی مطبوعات وزیر اعظم کو ہدیہ کے طور پر پیش کیں۔ ان مطبوعات میں "ہندوستان کی نئی تاریخ" بھی تھی۔

شری نہرو نے انسٹی ٹیوٹ کے کام میں دلچسپی کا اظہار کیا۔ آخر میں وزیر اعظم نہرو نے سوویت عالموں کا کتابوں کے تحفے کے لئے شکریہ ادا کیا اور کہا کہ ان علمی تصنیفات سے ظاہر ہوتا ہے کہ سوویت یونین میں ہندوستان کے تاریخی اور تہذیبی ورثے کے مطالعے پر کتنی توجہ صرف کی جا رہی ہے۔

یوتھ اُردو ایسوسی ایشن، تاتار پور

یوتھ اُردو ایسوسی ایشن، تاتار پور، بھاگلپور کی ۹۵ ویں ادبی نشست ۱۰ مارچ ۱۹۶۳ء کو زیر صدارت حسن مقصود صاحب منعقد ہوئی۔ نصر حمید غلش صاحب کی ایک اچھوتی کہانی "کہانی کی تخلیق" سے نشست کا آغاز ہوا۔ پھر علی حسن ظفر، اشرف جاوید، ایم۔ اے۔ حسن رہبر اور مختر روشن آرا نے مختصر کہانیاں پیش کیں۔ پروفیسر شاہین غازی پوری اور نصر حمید غلش نے نظمیں سنائیں۔ (سکریٹری تسنیم کوثر)

ضروری اعلان: براہ مہربانی خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجئے۔

منیجر

معاصر

انجمن مصنفین کے قیام کی ضرورت

ہمارے ملک کا بعض امور میں باوا آدم ہی نرالا ہے۔ جہاں ترقی پذیر ملکوں میں اہلِ علم اور اہلِ ادب کو معاشرے میں سب سے بلند منصب دیا جاتا ہے اور انھیں ہر نوع کی سہولیات میسّر ہوتی ہیں اور اس کے علاوہ ایک کتاب کا ایک ایڈیشن کئی لاکھ کا چھپتا اور فروخت ہوتا ہے، وہاں ہمارے ہاں ادیبوں اور شاعروں کو سماج میں کوئی اہمیت نہیں دی جاتی۔ حکومت کی طرف سے انھیں کوئی سہولت نہیں ملتی اور ایک کتاب کا ایک ہزار کا ایڈیشن کئی سال تک گاہکوں کی راہ دیکھتا رہتا ہے۔ پھر اگر کسی کتاب کی کچھ جلدیں فروخت ہوتی بھی ہیں تو وہ روپیہ پبلشر کی تجوری میں بند ہو جاتا ہے، جہاں سے نکلوانے کے لئے ہزار ہا پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں مگر کامیابی شاذ ہی ہوتی ہے۔ اس طرح ہمارے ملک میں اہلِ ادب کو دوگونہ عذاب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ معاشرے کی سرد مہری اور پبلشر کی دھاندلی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ادیب کی ساری عمر کس مپرسی کے عالم میں بیت جاتی ہے۔ نئے ادیبوں کی دستگیری کرنے کے لئے کوئی پبلشر تیار نہیں ہوتا اور بعض مستند ادیب عمر بھر سرمائے کے فقدان کے سبب گمنامی کے قعرِ ذلت سے اُبھرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ ان گنت مثالوں میں سے منشی پریم چند کی حالت پر غور کیجئے۔ بطور افسانہ نگار ان کی شہرت ان کے جیتے جی ہندوستان کی سرحدوں کو پھلانگ کر دنیا بھر میں پہنچ چکی تھی۔ وہ عمر بھر ہمارے لئے جگر کاوی اور دماغ سوزی سے کام لیتے رہے لیکن ہم نے معاوضے میں انھیں کیا دیا؟ فلاکت، عسرت اور بیماری۔ نہایت تنگ دستی کے عالم میں انھوں نے ساری عمر گزاری۔ انتڑیوں کی بیماری کے علاج کے لئے انھیں کبھی روپیہ پیسہ میسّر نہ آسکا اور اس بیماری کے باعث وہ واصل بحق ہو گئے۔ آج بھی ملک بھر میں ان ادیبوں کی تعداد شاید انگلیوں پر گننے کے لائق بھی نہ نکلے جنھوں نے لکھنے کو بطور پیشہ اپنا لیا ہے اور وہ فارغ البال ہیں۔ ورنہ تقریباً سب کے سب فاقہ کشی کا شکار رہیں۔ زمانے کی سرد مہری کے شاکی ہیں۔ قدم قدم پر انھیں ذلت کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اسی لئے کوئی ادیب بطور پیشہ تخلیقی ادب کو اپناتا نہیں ۔ ان حوصلہ شکن حالات میں ان سے اعلیٰ درجہ کی تخلیقات کی امید رکھنا فضول ہے!

آزادی کے بعد مرکزی سرکار نے ساہتیہ اکادمی قائم کی۔ اس نے ادب اور ادیبوں کی حوصلہ افزائی کی۔ مختلف ریاستوں کی طرف سے بھی اس ضمن میں کچھ کارروائیاں کی گئی ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ نہایت محدود پیمانے پر ہوا ہے اور اس سے صرف اکّا دکّا ادیبوں کو فائدہ اٹھانے کا موقع ملا ہے۔ عام طور پر ادب اور ادیبوں کے لئے فضا پہلے کی طرح ناسازگار ہے۔

سوال یہ ہے کہ اس بحران کا کیا کوئی پائدار حل ممکن نہیں؟ جواب یہ ہے کہ ممکن ہے اور وہ حل یہ ہے کہ ادیب خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہوں۔ دوسرے ہماری امداد اسی وقت کریں گے جب ہم اپنی مدد آپ کریں گے۔ ہمارے جنوبی ریاست کیرلا کے ادیبوں نے مل کر ایک انجمن امداد باہمی بنائی ہے جو ادیبوں کے مالی معاملات کو ہاتھ میں لیتی ہے اور انھیں بخوبی سلجھاتی ہے۔ کتابوں کی اشاعت اور فروخت کا کام کرتی ہے لیکن ایک ریاست کے ادیبوں کی انجمن کا کام محض ریاست تک محدود ہونے کے باعث بہت کم ادیب اس سے مستفید ہو سکتے ہیں۔

ضرورت ہے کہ کل ہند پیمانے پر مصنفین کے ادارہ کا قیام بلا تاخیر عمل میں لایا جائے۔ اس کا صدر دفتر مرکزی راجدھانی دہلی میں ہو۔ ریاستی انجمنوں کے دفاتر ریاستی راجدھانیوں میں اور ضرورت کے مطابق ذیلی دفاتر مناسب مقامات پر قائم کئے جائیں۔ سب ادیب یا ادب سے شغف رکھنے والے اس ادارہ کے اراکین بنائے جائیں جو سالانہ چندہ کی صورت میں مناسب رقم ادا کریں۔ اس سے انجمن کا سرمایہ ابتدائی صورت میں قائم ہو سکتا ہے۔ سرکار سے اس ادارہ کے لئے امداد طلب کی جائے جو موجودہ حالات میں تھوڑی سی جدوجہد کے ساتھ حاصل ہو سکتی ہے۔ یہ ادارہ نوآموز ادیبوں کی رہنمائی کرے۔ کتابیں شائع کرے اور ان کی فروخت کا بندوبست کرے۔ پرانے ادب اور تصنیفات کی نسبت ریسرچ کرے۔ شاہکار تخلیقات کا مختلف قومی زبانوں میں ترجمہ کرانے کا بندوبست کرے۔ بدیشی زبانوں سے ترجمہ کرے اور دیسی زبانوں کی اہم تصنیفات کو ترجمہ کر کے دیگر ممالک کے ادب دوست حلقوں سے متعارف کرائے۔ حسب ضرورت ادیبوں کی مالی امداد کرے۔ کسی ادیب کی ناگہانی وفات پر اس کے عیال و اطفال کا کفیل ہو۔ غرض اس طرح کے ادارہ کے قیام سے ادیبوں کی تمام مشکلات کا حل ممکن ہے۔ اور اس طرح جب ہم خود اپنی قدر کریں گے تو سرکار اور معاشرہ بھی ہمیں سر آنکھوں پہ جگہ دے گا۔ (چگندہی)

شاغل عثمانی

امیر خسرو

۶۵۱ھ ہجری میں موضع مومن آباد عرف پٹیالی ضلع ایٹہ (یو۔پی) میں آباد ایک لاچین ترک امیر سیف الدین کے گھر میں ایک بچہ پیدا ہوا کس کو خبر تھی کہ یہ آبروئے ہندوستان بنے گا۔ کون جانتا تھا کہ یہ مختلف بلکہ متضاد فنون کا اعلیٰ سعترو ماہر ہوگا۔ کیا معلوم تھا کہ یہ دنیادار امیر درویش روشن ضمیر نکلے گا۔ پیر پرست بھی ہوگا اور محبوب پیر بھی، ظریف بھی اور متین بھی، عاشق بھی اور معشوق بھی، پابند شرع بھی اور موجد نغمہ و ستار بھی، فارسی قصائد میں خاقانی کا ہم پلہ، مثنوی میں نظامی گنجوی کا جواب اور اس زور و شور کے ساتھ کہ

غلغلۂ شاعریم شد بلند		زلزلہ در گور نظامی فگند

دراصل پایہ زبردست تھا۔ ورنہ کس کی مجال کہ یوں کہے۔

سعدی نے اس کی طبع جواہر خیز اور جوہر قابل ہونے کی تعریف کی۔ ہندوستانیوں نے اس کو "جگت گرو" مانا اور ایرانیوں نے سخنور نامور، گویا سرزمین ہند نے یہ پہلا حکیم پیدا کیا جو فارسی کا عظیم المرتبت شاعر و ستار نواز تھا ہی۔ اردو کا بھی پہلا شاعر ہوا اور ساتھ ہی ہندی کا استاد کوی بھی۔ اس نے ہندی میں دوہے، سورٹھے، کبت، گیت، پہیلیاں، مکرنیاں، دو سخنے، انملیاں اور خدا جانے کیا کیا کہا۔ حاضر جوابی، بدیہہ گوئی، بذلہ سنجی، اور لطیفہ گوئی میں کوئی ہندوستانی اس کا جواب نہیں ہو سکتا۔ اسی حد تک نہیں، بلکہ اب سے تقریباً سات سو برس پہلے امیر خسرو نے وہ کام نہایت کامیابی کے ساتھ کیا ہے کہ جس کا آج بہت زور اور ہر زبان پر خوب شور ہے۔

مذہبی حیثیت سے شہور تاریخی واقعہ پر نظر ڈالئے جس پر شہنشاہ وقت نورالدین جہانگیر کی مہر تصدیق ثبت ہے۔ وہ اپنی "تزک" میں لکھتا ہے کہ میری مجلس میں قوالوں نے یہ شعر گایا:

ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے
من قبلہ راست کردم برسمت کجکلاہے

(یعنی ہر قوم کا ایک طریق ہے ایک دین ہے، اور عبادت کے وقت جھکنے کی ایک سمت ہے۔ میں نے بھی ایک ٹیڑھی ٹوپی والے کی طرف اپنا قبلہ درست کیا ہے) جہانگیر نے اس شعر کا شان نزول پوچھا تو ملا علی احمد نے بیان کیا کہ ایک بار حضرت نظام الدین محبوب الٰہیؒ جمنا کے کنارے ایک کوٹھے پر تشریف فرما تھے، اور ہندوؤں کے اشنان اور پوجا کا مشاہدہ فرما رہے تھے۔ خسرو بھی حاضر تھے۔ حضرت نے پہلا مصرع فرمایا۔ اس وقت حضرت کے سر مبارک پر ٹوپی ذرا ٹیڑھی تھی۔ خسرو نے برجستہ اس طرف اشارہ کرتے ہوئے دوسرا مصرع لگایا۔ ع: من قبلہ راست کردم برسمت کجکلاہے۔ جہانگیر لکھتا ہے کہ دوسرا مصرع ختم ہوتے ہوتے ملا کی حالت متغیر ہونا شروع ہوئی یہاں تک کہ وہ غش کھا کر گرا دیکھا تو روح نہ تھی۔

یہ واقعہ بھی بجا صحیح و درست مگر یار شاہ اور درویشاں کے الفاظ پر تو غور فرمائیے مصرع اولیٰ ہے۔ ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے ہر قوم کے دین کا اعتراف اور ہر قوم کی قبلہ گاہ کا اقرار بھی ہے۔ اور راست کا لفظ جو بروئے قواعد را اور است کا مرکب ہی سہی کر راہے کے ساتھ "راست راہے" کس خوبی و خوبصورتی اور جوش صداقت و وفور محبت کے ساتھ فرمایا ہے جس سے ذوق سلیم راستی کی طرف بطرز لطیف منتقل ہو جاتا ہے۔ اور پھر مصرع ثانی میں اسی لفظ کو خسرو نے کس برجستگی و عقیدت مندی کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ من قبلہ راست کردم برسمت کج کلاہے۔ راست و کج کی صنعت تضاد بھی قابل توجہ ہے۔ اس طرح پورے شعر میں راستی ہی راستی ہے۔ یہی مشائخ کا مذہب ہے اور اسی کی آج ضرورت ہے اور یہی مذہبی طریق پر اتحاد قومی کا نمونہ ہے۔ ع۔ عیسیٰ بدین خویشتن موسیٰ بدین خویشتن۔

یہی اتحاد قومی ملک قوم کی فلاح و بہبود، سربلندی و وقار اور افتخار و عزت کا ضامن ہے۔ نیز آرام و آسائش اور فارغ البالی کا موجب۔ یہ درویشوں کی رہنمائی ہے اور نصیحت فرمائی۔ کیسے درویش دل کے امیر کبیر اور خدا کے فقیر۔ خسرو جیسا پیر پرست جس کا واقعہ ہے کہ حضرت محبوب الٰہی کی خدمت میں ایک درویش حاضر ہو کر مالی امداد کا طلبگار ہوا۔ آپ نے فرمایا کہ آج جو کچھ فتوح ہوگی تجھے دی جائے گی مگر کچھ نہ ہوئی۔ دوسرے دن بھی یہی ارشاد ہوا۔ مگر اس دن بھی کچھ نہ آیا تو حضرت نے اپنی جوتیاں اس کو عطا کر دیں۔ درویش نے پورے اعتقاد کے ساتھ لے لیں اور روانہ ہو گیا۔ امیر خسرو سلطان قطب الدین کو مثنوی نہ سپہر سنا کر اور ہاتھی کے وزن کے برابر زر و نقد کا انعام لے کر دلی آ رہے تھے۔ رستے میں دونوں کی ملاقات ہوئی۔ خسرو نے پیر و مرشد کی خیر و عافیت دریافت کرنے کے بعد کہا کہ تجھ سے مجھے اپنے پیر کی خوشبو آتی ہے کیا تیرے پاس کوئی تبرک ہے اس نے کہا ہاں اور نعلین پیش کیں خسرو نے کہا ان کو بیچتے ہو تو یہ پانچ لاکھ روپیہ حاضر ہے۔ درویش نے منظور کیا اور خرید فروخت کے بعد اپنی اپنی راہ لی۔ خسرو دلی پہنچے تو نعلین شریف سر پر رکھ کر حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ محبوب الٰہیؒ نے فرمایا کہ پانچ لاکھ میں یہ جوتیاں سستی خرید لیں۔ عرض کیا قبلہ حاجات درویش اسی قدر رقم پر راضی ہو گیا ورنہ تمام مال اور جان بھی مانگتا تو دے دیتا۔ یہی عقیدت و محبت تھی کہ حضرت فرمایا کرتے تھے کہ "اے ترک من از وجود خود بر تنگم لیکن از تو نہ تنگم" (میں اپنے آپ سے ناراض ہو سکتا ہوں مگر اے ترک تجھ سے نہیں ہو سکتا) دیکھ لیجئے آج بھی دربار محبوب الٰہی میں حاضری ممکن نہیں جب تک ان کے محبوب خسرو کی آستاں بوسی نہ کر لی جائے۔

اقبال کرشن

ٹیگور رسائل میں

نیرنگستان۔ خاص نمبر جنوری ۱۹۳۵ء کے صفحہ ۶۱ پر "مصیبت یا سکون" کے عنوان سے "ٹیگور کے ایک شاہکار" کا ترجمہ از ر۔ حمانی۔

نیرنگ خیال۔ سالنامہ دسمبر ۱۹۳۱ء میں صفحہ ۹ پر "باغبان" کے عنوان سے ٹیگور کی ایک نظم کا ترجمہ عبدالمجید سالک کے قلم سے۔ صفحہ ۱۵ پر "ٹیگور کے تین جام" کے عنوان سے ٹیگور کی تین نظموں کا ترجمہ: شاعر اور رات، آفتاب اور شبنم، میں اور تم۔ وصی رضوی مترجم ہیں۔

نیرنگ خیال۔ سال نامہ دسمبر ۱۹۳۲ء میں صفحہ ۲۸ پر "باغبان" کے عنوان سے ٹیگور کی ایک نظم کا منثور ترجمہ۔ ترجمہ جناب عبدالمجید سالک صاحب کے قلم سے۔

عالمگیر۔ سالانہ نمبر ۱۹۳۲ء کے صفحہ ۲۲ پر انشائے لطیف کے عنوان سے "امید کی جھلک" اور "نغمہ"۔ مترجم محمد امیر آسی رام نگری۔

سالانہ نمبر جون ۱۹۳۱ء کے صفحہ ۱۹ پر ٹیگور کی مشہور نظم تاج محل کا ترجمہ بعنوان "تاج"۔ ترجمہ جناب ظفر قریشی دہلوی کا۔

صفحہ ۸۲ پر "جذبات ٹیگور" کے عنوان سے کسی نظم کا ترجمہ، شاطر غ۔ نوی کے قلم سے۔

سالانہ نمبر ۱۹۳۲ء، صفحہ ۱۵۹، یاد ایام عشرت فانی کے عنوان سے ٹیگور کی ۲ نظموں کا ترجمہ۔ مترجم، سید یوسف بخاری۔

خاص نمبر ۱۹۳۲ء، صفحہ ۳۰، عیش و غم سے معنون ٹیگور کی ایک نظم کا ترجمہ سید یوسف بخاری صاحب کے قلم سے۔ صفحہ ۳۰، منظوم ترجمہ مولانا اظہر اسرت سری کے قلم سے بعنوان تو نصف خواب محبت ہے نصف عورت ہے۔

یہ ہوا دریا میں سے ایک قطرہ! ورنہ اگر باقاعدہ کام کیا جائے تو ایک ایسا مجموعہ تیار ہو جائے جو کلیات ٹیگور سے بھی، ضخامت میں آگے نکل جائے۔

مالک انجمن ترقی اردو علی گڑھ، پبلشر نذیر حسن، پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپوا کر مرکزی انجمن سے شایع کیا